© rasailojaraid.com

عبدالمجید قریشی
ملتان

کاروانِ خطابت کا آخری نقیب

یہ منزلت بھی غنیمت ہے اہلِ دنیا کی
ملا کے خاک میں ذکرِ کمال کرتے ہیں

بچپن کی سنی ہوئی کہانیوں میں سے ایک کہانی یوں شروع ہوتی تھی کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا جس کی ایک بیٹی تھی، نہایت حسین وخوش جمال، شہزادی کے حسن کا یہ عالم تھا کہ ہنستی تھی تو پھول برستے تھے اور روتی تھی تو موتی جھڑتے تھے۔ امیرِ شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں میں آگے چل کر مجھے کچھ ایسے ہی حسین وجمیل مناظر دیکھنے کے مواقع میسر آئے۔ ان کی تقریریں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے یہ شعر شاید ان ہی کی سحر بیانی اور طلاقتِ لسانی سے متأثر ہو کر کہا تھا ؎

شبنم کہیں گرائی، کہیں گُل کھلا دیا
رو دیا کہیں کوئی تو کسی کو ہنسا دیا

انگریزی زبان میں مقرر کے لئے عام طور پر لیکچرر اور سپیکر کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جہاں حضرت شاہ صاحب مرحوم ومغفور کی خطابت کا ذکر مقصود ہوگا وہاں ہمیں اُن کے لئے انگریزی لغت سے لفظ (ORATOR) کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ان کی تقریریں بلاشبہ فصاحت وبلاغت کا ایک نادر اور بے مثال مرقع ہوتی تھیں۔ وہ جو مرزا غالب نے فرمایا ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا،
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

تو خدا ہی جانے کن کے لئے فرمایا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب شاہ صاحب تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو سلاست و روانی اور برجستگی بے اختیار ان کی زبان کے بوسے لیتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس قومی کاروانِ خطابت کے آخری نقیب تھے جس کے سالارِ اوّل نواب محسن الملک مرحوم تھے۔ نواب صاحب کا [illegible] کہ انہیں اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سامعین پر اتنا ہی اختیار ہوتا تھا جتنا اختیار ایک کمہار کو مٹی پر ہوتا ہے ۔ یہ کمہار کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ گندھی ہوئی مٹی کو جس شکل میں چاہے تبدیل کردے ۔ اسی دور کے ایک بلند پایہ خطیب شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی بھی تھے ۔ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں کی بھی دنیائے خطابت میں دھوم مچی ہوئی تھی ۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجتماعات ہوں یا انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسے، ڈپٹی صاحب خصوصی طور پر ان میں مدعو کیے جاتے ۔ ان کے بغیر قوم کی ان محفلوں کا رنگ نہ نکھرتا اور لوگ جب تک ان کو سن نہ لیتے ، بے کیفی سی محسوس کرتے رہتے ۔

شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد دہلوی کی وفات (۱۹۱۲ء) کے وقت برصغیر کے سیاسی مسائل میں دور رس تبدیلیاں رُونما ہو چکی تھیں ۔ سیاسی جماعتیں اور ان کے رہنما جو ابھی کل تک حکومتِ وقت سے وفاداری بشرطِ اُستواری کی پالیسی پر گامزن تھے ۔ رفتہ رفتہ اب اس راہ سے ہٹتے چلے جا رہے تھے اور حکمرانوں کو آنکھیں دکھانے لگے تھے ۔ بلکہ مولانا حسرت موہانی نواب سے کوئی چار یا پنچ سال قبل ہی اپنے ماہنامے "اردوئے معلّٰی" میں شائع کردہ ایک مضمون کی بنا پر بہ جرمِ بغاوت حوالۂ زنداں کئے جا چکے تھے ۔ برصغیر کے عوام اب بادۂ حریّت سے سرشار ہو چکے تھے اور اس نشے کا اتارنا کسی ترشی کے بس کی بات نہ رہی تھی ۔ اس وقت گلستانِ خطابت میں جیسے فصلِ بہار آگئی تھی ۔ مسلمانوں کے نوجوان طبقے میں مولانا محمد علی جوہر ، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان میدانِ خطابت میں ابھرے اور بڑی شان کے ساتھ ابھرے ، ان کے ذرا بعد آنے والوں میں مولانا احمد سعید دہلوی ، مولانا شبیر احمد عثمانی ، مولانا حسین احمد مدنی ، نواب بہادر یار جنگ ، ڈاکٹر کے ایم اشرف ، مولانا محمد داؤد غزنوی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے ۔ ان حضرات کے میدان ہائے عمل مختلف تھے مگر مطمحِ نظر ایک ہی تھا اور وہ تھا حصولِ آزادئ وطن ، حضرت شاہ صاحب کا اسم گرامی میں " ترکش مارا خدنگ آخریں" کے طور پر آخر میں لے رہا ہوں ورنہ جہاں تک ان کی شخصیت اور فن کا تعلق ہے وہ ہمیں ہر جگہ ممتاز ، یکتا اور منفرد نظر آتے ہیں ۔ حقیقت میں اس ملک میں وہ فنِ خطابت کے امام تھے ۔ جن لوگوں کو " الف لیلہ" پڑھنے یا سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس کتاب میں کس طرح ایک کہانی سے دوسری کہانی جنم لیتی جاتی ہے ۔ کچھ ایسا ہی انداز شاہ صاحب مرحوم کی خطابت کا تھا گو وہ اپنی تقریر کے بہاؤ میں نفسِ مضمون سے کوسوں دور نکل جاتے تھے لیکن ان کی تقریر کی دلکشی و دلرُبائی کی یہ کیفیت ہوتی کہ بعض دفعہ عشاء سے فجر ہو جاتی تھی ، نہ کوئی اکتاتا اور نہ کسی آنکھ میں نیند آتی ۔ قرآن کریم کی تلاوت کا ان کا اپنا لب و لہجہ تھا ۔ یہ فریضہ وہ بڑے سوز و گداز کے ساتھ انجام دیتے ایک ہندو دوست نے کیا ہی خوب کہا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کو معجزے کے طور پر دیکھنا ہو تو سید عطاء اللہ شاہ کو آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھو!

شاہ صاحب کی تقریر میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں قیام دلی کے دوران میں سُنی۔ پہاڑ گنج میں تانگوں کے اڈّے کے برابر ایک بڑا سا گول میدان ہوا کرتا تھا جسے گول چکر کہا جاتا تھا یہ جگہ ہمیشہ جلسہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مجھے شاہ صاحب کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا پہلے پہل یہیں اتفاق ہوا تھا۔ وہ منظر اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

ان دنوں برسات کا موسم تھا۔ گیارہ بجے شب کے قریب جب حضرت شاہ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو آسمان پر دُور دُور تک سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ تقریر کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ پانچ سات منٹ بعد یہ پھوار ننھی منّی بوندوں میں تبدیل ہو گئی۔ موسم کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر سامعین کچھ کسمسائے لیکن اُٹھے نہیں اور شاہ صاحب کی تقریر جاری رہی گو بوندیں ان کے اوپر بھی گر رہی تھیں۔ لیکن وہ تقریر کے ساتھ ساتھ حاضرین کی ذہنی کشمکش کا لطف اٹھانے پر تُلے ہوئے تھے۔ بارش ہلکے پھلکے انداز میں جاری تھی کہ دو ایک آدمی اٹھنے لگے۔ انہیں اٹھتا ہوا دیکھ کر شاہ صاحب جوش میں آ گئے فرمانے لگے! "دلّی والو! بس اتنے ہی مرد ہو کہ ذرا سی بوندوں سے گھبرا گئے۔ اس برتے پر تم عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کے لئے آئے تھے؟ ارے بخاری کی تقریروں میں تو تمہیں انگریزوں کی رائفلوں کی گولیاں بھی کھانی پڑیں گی اور تم ہو کہ ان دو چار بوندوں ہی سے ڈر کر بھاگنے لگے۔ یاد رکھنا اگر بھاگ گئے تو پھر کبھی پہاڑ گنج کا منہ نہ دیکھوں گا۔ ہاں یاد آیا، تم بھی پیسے ہوا جیب میں رکھے ہوئے نوٹوں کا خیال آ گیا ہو گا۔" ان الفاظ کا شاہ صاحب کے منہ سے نکلنا تھا کہ لوگ دبک کر بیٹھ گئے۔ جلسے کا رنگ جم گیا حتّٰی کہ چند لمحات کے بعد بارش بھی تھم گئی۔

حضرت شاہ صاحب کے ایک دوسرے جلسے کا ایک دلچسپ اور پر لطف واقعہ انہی دنوں مجھے اپنے والد صاحب مرحوم کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا پاکستان کے قیام سے پہلے انبالہ (مشرقی پنجاب) میں "انجمن تبلیغ اسلام" کے نام سے ایک انجمن ہوتی تھی جس کے صدر میر غلام بیگ نیرنگ مرحوم تھے۔ میر صاحب اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر اور معتدل مزاج کے سیاست دان بھی تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک مرکزی اسمبلی میں انبالہ ڈویژن کے مسلمانوں کی بلا مقابلہ نمائندگی بھی فرماتے رہے۔ انجمن تبلیغ اسلام کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے محض تبلیغ دین تھا۔ سیاسیات سے غالباً اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک مرتبہ انجمن کا سالانہ جلسہ انبالے میں منعقد ہونا قرار پایا میر صاحب نے ہندوستان کے جن مشاہیر علمائے کرام کو اس موقع پر مدعو کیا ان میں حضرت شاہ صاحب بھی تھے۔ میر صاحب نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ صاحب سے وعدہ لے لیا تھا کہ ان کی تقریر محض تبلیغی ہو گی اور سیاسیات سے انہیں بہرصورت دامن بچانا ہوگا لیکن شاہ صاحب بھلا کہاں چوکنے والے تھے، پھر پھرا کر آخر سیاست پر آ ہی گئے اور اپنی تقریر کا رخ فرنگی استعمار کے خلاف پھیر دیا۔ میر صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو کیا کہنے، بس چپکے سے کرسئ صدارت چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ دوران تقریر اب جو شاہ صاحب نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو کرسئ صدارت سے میر صاحب قبلہ غائب! شاہ صاحب مسکرائے اور فرمانے لگے "اچھا بھاگ گئے، اب تم صدارت کرو میرے بھائی"۔ یہ کہہ کر اپنا موٹا سا لکڑی کا ڈنڈا کرسئ صدارت پر رکھ دیا جس کا سامعین نے قہقہوں سے استقبال کیا۔

ملتان کا ذکر ہے مدرسہ قاسم العلوم کا سالانہ جلسہ تھا۔ جمعے کا دن تھا اور حاضرین کی کثرت سے باغ لانگے خاں جہاں یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا، پٹا پڑا تھا۔ جلسے کے مقررین میں حضرت شاہ صاحب کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی اور تقاریر کا سلسلہ جاری تھا لیکن شاہ صاحب ابھی تشریف نہ لائے تھے اور لوگ بے چینی سے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے شاہ صاحب کی صورت نظر پڑی اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر میں شاہ صاحب مائیکروفون کے سامنے تشریف لائے اور فرمانے لگے "ملتان والو! آج میں اپنی تقریر کا وقت ایک اور صاحب کو دے رہا ہوں جو ماشاء اللہ بہت ہی دلکش پیرائے میں تقریر فرمائیں گے"۔ لوگوں نے یہ سنا تو چلانے لگے "نہیں شاہ صاحب آپ تقریر فرمائیں۔ ہم آپ کو سننا چاہتے ہیں"۔ شاہ صاحب بڑے تیکھے لہجے میں فرمانے لگے "اللہ کے بندو! اللہ کی سرزمین ابھی اس کے نیک بندوں سے خالی نہیں ہوئی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری علاوہ بھی کچھ اور لوگ اس دنیا میں موجود ہیں جنہیں خدائے بزرگ و برتر نے قوت گویائی سے مالا مال فرمایا ہے"۔ "نہیں شاہ صاحب آپ!" پھر کچھ لوگ چلائے "نہیں نہیں" شاہ صاحب کے لہجے میں اب قدرے تلخی تھی "آنے دیجئے حافظ صاحب تشریف لائیے"۔

لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج سے ایک نابینا بزرگ اٹھے اور مائیکروفون کی جانب بڑھنے لگے۔ شاہ صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں مائیکروفون کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ بزرگ ڈیرہ غازی خان کے حافظ اللہ وسایا صاحب تھے۔ حافظ صاحب نے خطبۂ مسنونہ کے بعد قرآن حکیم کا ایک رکوع اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ تلاوت فرمایا کہ لوگ مسحور ہو گئے۔ واقعی شاہ صاحب نے درست فرمایا تھا۔ تلاوت کے بعد حافظ صاحب نے فضائل حدیث پر ملتانی زبان میں تقریر کا آغاز کیا۔ عجب مٹھاس، حلاوت اور شیرینی تھی ان کی تقریر میں کہ مقامی اور مہاجر سبھی جھوم رہے تھے۔ مجھے اس روز محسوس ہوا کہ لسانی تعصب کس قدر غیر ضروری اور بے معنی سا جذبہ ہے۔ کسی زبان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہمیں اُس وقت ہوتا ہے جب ہم اُس زبان کو کسی اہلِ زبان کی زبانی سنتے ہیں۔ زبان کوئی بھی ہو از خود بری نہیں بلکہ ہماری عصبیت اور کوتاہ نظری اسے ہمارے دل و دماغ کے سامنے بُری شکل میں پیش کر دیتی ہیں۔

۱۹۵۷ء کی ابتدا میں ملتان ہی کے ایک جلسے میں شاہ صاحب اپنی تقریر میں اُس جنگِ اقتدار پر تبصرہ فرما رہے تھے جو پاکستان میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد لڑی جا رہی تھی۔ جب چندریگر مرحوم کا ذکر آیا تو انہوں نے ایک چھوٹا سا فقرہ کہا جسے سن کر لوگ پھڑک اٹھے فرمایا "ایک چلہ وہ بھی کاٹ گئے"۔ یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ چندریگر صاحب کی وزارتِ عظمیٰ کی عمر قریب قریب چالیس دن ہی تھی۔

حضرت شاہ صاحب کا ایک یادگار واقعہ مجھے مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب مرحوم مالک دواخانہ سلیمانی جہانیاں نے بھی سنایا تھا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کے قیام کو ابھی چند ماہ گذرے تھے ان دنوں واہگہ کی سرحد پر دونوں ملکوں کے شہریوں میں تبادلے کا سلسلہ چل رہا تھا اور سکھ تاجر من جملہ اور اشیاء کے نادر و نایاب اسلامی کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت کر جاتے تھے یہ گرانمایہ کتابیں مشرقی پنجاب کے اسلامی کتب خانوں کی متاعِ بے بہا تھیں۔ مشرقی پنجاب کے خونیں ہنگاموں میں ہزارہا کتابیں نذرِ آتش کر دی گئیں، کتنی ہی کتابوں کو دریا برد کر دیا گیا قرآن کریم اور احادیثِ رسولؐ کے اوراق بازاروں میں روندے گئے۔ بہر حال جو کتابیں محفوظ رہ گئیں وہ اس طرح فروخت کی جا رہی تھیں۔ ان بیچنے والوں کو کیا معلوم کہ یہ کس کان کے جواہر یکتا ہیں اور ان کے خریدنے اور جمع کرنے والوں نے خدا جانے کس کس طرح خریدا اور جمع کیا تھا۔ انہی ایام میں ایک صاحب نے میرے لئے دو کتابیں خریدیں جن میں سے ایک مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور تفسیر "بیان القرآن" تھی جس کی بارہ جلدیں یکجا مجلّد تھیں۔ اس کتاب کو صرف پانچ روپے میں خریدا گیا تھا حالانکہ اس زمانے میں یہ بالکل نایاب تھی اور سو سوا سو روپے سے کم میں نہیں ملتی تھی۔ دوسری کتاب "مفردات امام راغبؒ" تھی۔ اس کتاب کا شمار بھی نہایت کمیاب کتابوں میں ہوتا تھا اور یہ صرف دو روپے کے عوض حاصل کی گئی تھی۔ اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "پیش کش من جانب محمد گل شیر بخدمت گرامی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کتاب کو مولانا محمد گل شیر صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا اور جب فسادات امرتسر میں دوسرے کتب خانوں کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کا کتب خانہ بھی لٹا تو کتابیں بکھر بکھر کر فروخت ہونے کے لئے واہگہ کی سرحد پر آ گئیں۔ مجھے جب اس کتاب کا تعلق شاہ صاحب کی ذاتِ گرامی سے معلوم ہوا تو میں بے چین ہو گیا اور اگلی مرتبہ جب لاہور جانا ہوا تو اسے اپنے ساتھ لیتا گیا تاکہ اسے شاہ صاحب کے حوالے کر دوں۔ میں اس مقصد کے لئے سب سے پہلے مجلس احرار کے دفتر پہنچا جہاں ان دنوں شاہ صاحب تشریف فرما تھے۔ چونکہ شاہ صاحب اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقت کہیں باہر تشریف لے گئے تھے اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی تاہم کتاب کو میں نے دفتر کے ایک صاحب کے سپرد کر دیا اور تاکید کی کہ اسے شاہ صاحب کی خدمت میں میری جانب سے پیش کر دیا جائے۔ شاہ صاحب کو جب کتاب ملی تو سنا ہے کہ شدتِ غم سے اُن کی آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھے ملاقات ہوئی تو بڑی ممنونیت کا اظہار فرمایا اور پھر اس واقعے کا ذکر مختلف محفلوں اور متعدد تقریروں میں بطور خاص کیا۔

اس واقعے کا تحیّر کن اور ناقابلِ فراموش پہلو یہ ہے کہ پہلی کتاب یعنی تفسیر بیان القرآن بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی ملکیت تھی۔ یہ تفسیر آج بھی میرے کتب خانے میں موجود ہے اور اس کے مختلف مقامات دیکھنے کا مجھے متعدد بار موقع ملا لیکن اس حقیقت کا پتہ مجھے شاہ صاحب کی حیات میں نہ چلا بلکہ ان کی وفات کے کچھ عرصے بعد یہ بات معلوم ہوئی اور وہ یوں کہ جس مقام پر بیان القرآن کی چوتھی جلد ختم ہوتی ہے وہاں ایک گوشے میں شاہ صاحب نے اپنے دست مبارک سے "احقر عباد اللہ السید شرف الدین احمد المعروف بہ سید عطاء اللہ البخاری العظیم آبادی عفرلہ الباری" تحریر فرمایا ہوا تھا۔ مجھے شاہ صاحب کے یہ الفاظ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ ان کی یہ علمی نشانی میرے پاس ہی رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ حقیقی معنوں میں درویش تھے۔ ان کے فقر و غنا کا یہ عالم تھا کہ وہ امرتسر میں دو مکان چھوڑ کر آئے تھے لیکن انہوں نے اس جائداد کا کوئی کلیم کسی عدالت میں پیش نہیں کیا کہ جب اس جائداد کے بدلے یہاں جائیداد مل گئی تو ہجرت کا ثواب ہی جاتا رہے گا۔ شاہ صاحب کا یہی کردار ایک دوسرے واقعے سے بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔

دیر کی بات ہے شاہ صاحب اُن دنوں بہاولپور میں تشریف فرما تھے۔ نواب صاحب بہاولپور کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ڈیرہ نواب صاحب سے شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا اور ملاقات کی درخواست کی۔ سیکرٹری صاحب نواب صاحب کا پیغام لے کر شاہ صاحب کے پاس پہنچے شاہ صاحب نے سنا تو فرمایا کہ فقیر بادشاہوں کے دربار میں نہیں جایا کرتے۔ پھر ہنسے اور فرمانے لگے کہ اب تو میں ویسے بھی ان کی ریاست میں بحیثیت مہمان مقیم ہوں۔ اب یہ معزز میزبان کا کام ہے کہ وہ میزبان کی عزت و توقیر میں پیش قدمی فرمائیں۔ چنانچہ سیکرٹری صاحب واپس چلے گئے۔ اگلے دن نواب صاحب بہاولپور بہ نفسِ نفیس شاہ صاحب سے ملنے آئے اور دس ہزار روپے بطور نذرانہ پیش کیے۔ شاہ صاحب نے اس خطیر رقم کو قبول کرنے سے معذوری کا اظہار فرمایا اور کہا کہ "فقیر کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صبح و شام دو روٹیاں مل جاتی ہیں بس اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔ نواب صاحب نے بہت اصرار کیا تو ان کی تالیف قلب کے لیے دس ہزار روپوں میں سے صرف دس روپے اٹھا لیئے۔

© rasailojaraid.com